۵

اعلیٰ تعلیم: اشرافیہ اور کاروباری طبقے کی خدمت گار

یوسف جے پراگلر

اگر ہم اپنی جامعات کی استعماریت زدگی سے خلاصی کے موضوع پر بات کرنا چاہتے ہیں تو پہلے ہمیں اس بات کی نشاندہی کرنا ہوگی کہ کس چیز نے ہماری جامعات کو استعماریت زدہ کیا ہے۔ نصاب کی حد تک تو جامعات خود استعماریت زدہ کہلائے جانے کی مستحق ہیں کیونکہ نصاب تعلیم کا جھکاؤ دوسروں کے علوم کی قیمت پر بہت حد تک عصبیت زدہ علوم یا بقول چرچل ''سفید فام علوم'' (White Studies) کی جانب ہے۔ یہ پہلو تو ہر خاص و عام کو معلوم ہے اور اس نصابی عدم توازن کو کم کرنے کے لیے کوششیں بھی کی جارہی ہیں، لیکن ایک پہلو اور بھی ہے کہ جامعات استعماریت زدہ ہیں مگر اس پر بہت زیادہ بات نہیں کی جاتی۔

تقریباً چالیس برس قبل مارٹن کارنوئے (Martin Carnoy, 1974) نے ''استعماریت زدہ علم'' کا تذکرہ کیا تھا جس سے اس کی مراد مغربی تصورات پر مبنی مخصوص تفصیلی نصاب تعلیم یا نصابی کتب نہیں تھیں بلکہ اس کی مراد یہ تھی کہ جدید جامعات میں مجموعی طور پر ایسا نظام تعلیم رائج کیا جائے جو افسر شاہی پر مبنی سماجی ڈھانچے کو دوام بخشے اور اس ڈھانچے میں تعلیم کا مقصد اس افسر شاہی نظام پر تنقید یا اسے تبدیل کیے بغیر اسے جاری و ساری رکھنا تھا۔ بالفاظ دیگر، نصابِ تعلیم، نصابی کتب، طریقہ کار اور نظریات وغیرہ کے درجے سے بھی بڑھ کر زیادہ بنیادی سطح پر ہمیں اس امر پر توجہ مرکوز کرنے کی ضرورت ہے کہ مشن اور مقصد کے اعتبار سے جامعہ ایک استعماریت زدہ جگہ ہے۔

استعماریت زدہ تعلیم کی اصطلاح کا تعلق استعماریت کی براہِ راست اور انتہائی معروف شکل سے ہے۔ اس کا ایک تعلق طبقہ اشرافیہ میں شمولیت کے احساس سے ہے جسے بالادستی کے نظریات سے تقویت ملتی ہے۔ چنانچہ جامعہ اونچے طبقات کے لیے ایک ایسی جگہ بن جاتی ہے جہاں وہ تعلیم حاصل کریں اور پھر خود کو نمایاں کر سکیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس طریقے سے حاصل کیا گیا علم (یعنی جامعات کے اندر)، جامعات سے باہر حاصل شدہ علم کی نسبت بدرجہا بہتر ہے اور یہ کہ محققین اور منتظمین دوسرے لوگوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں صرف اسی نظریے — کہ سفید فام آدمی کا علم دوسرے سے بہتر ہے یا بدتر — کی مزاحمت کرنا کافی نہیں بلکہ آگے بڑھ کر ہمیں اس خیال کی بھی مخالفت کرنا ہوگی کہ طبقہ اشرافیہ کا جامعات پر مبنی نظامِ تعلیم مضبوط ہے اور اس خیال کی کہ عوامی علوم کی نسبت جامعات کا علم بہتر ہے بیخ کنی کرنا ہوگی۔ عوامی علوم سے مراد زراعت وصنعت سے متعلقہ علوم و دست کاری فنون یا بہت سارے دوسرے میدان اور مہارت کے شعبہ جات ہیں جو اداراتی علوم کے زمرے سے خارج ہیں۔

زمانہ قبل از جدید کے تربیتی اداروں سے تعلق ہونے کے باوجود جدید ترین جامعات کو نوآبادیاتی نظام اور جدید ریاستی نظام کی ضروریات کے مطابق قائم اور استوار کیا گیا اور اس نظام نے براہ راست نوآبادیاتی نظام کے قدیم ملبے ہی سے جنم لیا تھا۔ ایک نظام سے دوسرے نظام کی جانب منتقل ہونے کا بنیادی مقصد ایسے طبقہ اشرافیہ کی پیدائش، تربیت اور اسے قائم رکھنا تھا جو جدید معاشروں کو چلا سکے۔ اس نظام کے پیچھے طبقہ اشرافیہ کی یہ ذہنیت کارفرما تھی کہ عوامی فنڈز کو اعلیٰ تعلیم پر خرچ کیا جائے تاکہ مفکرین، انجینئروں، طبیبوں اور سیاست دانوں کی نئی کھیپ تیار کی جا سکے اور یہ یقین مستحکم کیا جا سکے کہ اس طبقہ اشرافیہ کا برقرار رہنا ہی پورے معاشرے کے لیے سودمند ہے۔ نوآبادیاتی نظام میں اس کی جڑیں ہونے کے باوجود، کم وبیش یہ نظام، عالمگیر جنوب میں، پچھلی صدی میں، خوب پھیلا ہے۔ تاہم نوآزاد خیالی (Neo-Liberalism) کے ابھرنے سے یہ تیزی سے زوال پذیر ہوا ہے جس کی وجہ سے بعض افراد یہ ماتم کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ 'جامعات تباہی سے دوچار' ہیں۔

جامعہ بطور کاروباری مرکز

درحقیقت نوآبادیاتی نظام کی براہِ راست باقیات طبقہ اشرافیہ اور بالادست طبقے کی صورت میں زندہ ہیں، بعض حالات میں انہوں نے قومی یا کثیر مملکتی کاروباری ادارے کی شکل اس طرح اختیار کرلی ہے کہ جامعہ اب منڈی کی ضروریات کی تابع بن رہی ہے (میوشی ۱۹۹۸ء)۔ ایسا اس وجہ سے ہے کہ ہم ایسے حالات میں ہیں جہاں جامعہ کی تعلیمی ضرورت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ پہلے کبھی نہ تھی۔ درحقیقت ہم کچھ بھی کہیں، یہ اس اعتبار سے جامعہ کی ناکامی ہے کہ اس نے مستقل بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کو مکمل یقین دلا دیا کہ جامعہ کی تعلیم ہی قابل قدر اور پسندیدہ ہے لیکن اس روز افزوں طلب کے باوجود حکومتیں اس علم کی رقم میں کمی کر رہی ہیں اور جہاں کہیں حکومتی رقوم پر تعلیم مہیا کی جارہی ہے، وہاں داخلے کے امتحانات کو مشکل سے مشکل تر بنا کر یا ایسے ہی دوسرے طریقوں سے عوامی رسائی مشکل ہو رہی ہے۔

جن عشروں میں جامعات کو اشرافیہ کی ذہنیت کے ساتھ چلایا جارہا ہے، لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس بات کی قائل ہوچکی ہے کہ اعلیٰ تعلیم کا حصول ہی کامیابی کی کنجی ہے اور اس کامیابی کو اعلیٰ ملازمت اور اس سے منسلک بہتر سماجی مقام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کو اس عام خیال سے بھی جوڑا جاتا ہے کہ جامعاتی تعلیم کی بدولت نچلے درجے کے سماجی طبقات کی ترقی کا عمل وقوع پذیر ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ معدودے چند لوگوں کے لیے یہ بات درست ہو لیکن چند ایک افراد کی ترقی ان بہت سارے افراد کو نچلی سطح پر لانے کا باعث ہی ہے جو اسی طویل اور انتہائی مہنگے عمل سے گزرے اور آخر میں آکر انہیں اس حقیقت کا ادراک ہوا کہ آخر میں ملنے والا صلہ تو شاذ و نادر ہی ملتا ہے اور یہ ہر ایک کے لیے نہیں ہے۔

اس کے باوجود کامیابی اور ترقی کی امید جامعاتی تعلیم کی طلب میں مسلسل اضافہ کر رہی ہے۔ اگرچہ اس امید نے اس حقیقت سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ روز بروز بڑھتے ہوئے فارغ التحصیل طلبہ کی طلب میں اس تیزی سے اضافہ نہیں ہو رہا جتنا خود ان کی تعداد میں ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے اعلیٰ

تعلیم نے اس مسئلے کو مزید پیچیدہ کر دیا ہے اور معاشرے میں ایسے فارغ التحصیل طلبہ گھوم پھر رہے ہیں جن کی اس معاشرے میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف طبقات اور خاندان، جامعہ کی ڈگری حاصل کر کے، ترقی، دولت اور اختیار کے حصول کی دوڑ میں اپنی اولاد کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے کے لیے بہت بوجھ کا شکار ہو رہے ہیں اس کے باوجود کہ اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ ایک ایسی اچھی ملازمت مل سکے گی جو ان کو مطلوبہ مقام دلا دے گی یا اس قدر زیادہ خرچ کی گئی رقم ہی واپس لوٹا دے گی۔

اعلیٰ تعلیم کی طلب میں اضافے کا ایک ٹھوس نتیجہ جامعات سے متعلق مالی پالیسیوں کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ جس سے نو آزاد خیالی (Neo-Liberalism) کے تصور کو بڑھاوا ملتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو عوامی رقوم کی ضرورت نہیں ہے اور اس رقم کو اب کسی اور جگہ خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے اعلیٰ تعلیم کے بجٹ میں نمایاں کمی دیکھنے میں آئی ہے۔ نتیجتاً بہت سی جامعات اس امر پر مجبور ہو گئی ہیں کہ وہ انہیں کاروباری اداروں کی طرز پر چلائیں جس کی وجہ سے روایتی مقصدیت بھرے پیغامات کی جگہ مالی امور اور کاروباری نعروں نے لینا شروع کر دی ہے۔ معاشی اعتبار سے اب جس بات کی اہمیت ہے وہ موزوں ترین کا بقاء ہی ہے، یعنی وہ جامعہ جو اپنے وسائل پیدا کرے، کامیاب گردانی جائے گی۔

بالفاظ دیگر، قومی جامعہ نے اب کاروباری جامعہ (Corporate University) کی شکل اختیار کر لی ہے۔ Readings کے ۱۹۹۷ء کے شمارے نے اسے روایتی تحقیقی جامعہ سے اعلیٰ مہارت کی جامعہ (University of Excellence) کی جانب تبدیلی قرار دیا ہے۔ یہاں اعلیٰ مہارت سے مراد ایک کھوکھلا تصور ہے جو حوالہ جاتی اقدار سے محروم اور کاروباری ذہنیت کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ Readings کے مطابق مہارتی جامعہ 'جدیدیت' کے تہذیب کے ساتھ مقابلے کے رجحان کو بھلا چکی ہے۔ دوسرے لوگوں نے اس تبدیلی کو اس امر سے تعبیر کیا ہے کہ جامعات بہت تیزی سے کاروباری اداروں کی اخلاقیات قبول کر رہی ہیں جس کے لیے 'کاروباری جامعہ' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اس اصطلاح کو آرونووٹز (Aronowitz, 2001) نے استعمال کیا تھا۔ اس سے مراد

ایسی جامعہ تھی جو ایک 'بڑے کاروباری ادارے کے طریقہ کار اور تصورات' کو اپنا لے اور جو 'تعلیمی معیار اور منصوبہ بندی کے بجائے حساب کتاب کے اصولوں کے اطلاق' کو ترجیح دے۔ کاروباری ادارے کی جانب سے چلائی جانے والی جامعہ سے کاروباری جامعہ اس طرح مختلف ہے کہ یہ خود ایک تجارتی ادارے کی طرز پر چلائی جاتی ہے۔

اس مختصر خاکے میں روایتی جامعہ کے کاروباری جامعہ میں تبدیلی کے عمل کو بیان کیا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یونیورسٹی کا طالب علم ہونے، اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں بطور استاد، محقق یا منتظم کام کرنے کا کیا مطلب ہے؟ جو کردار ہم ادا کر رہے ہیں، اس کی کیا حیثیت ہے؟ ہماری، طالب علموں، ان کے خاندانوں اور دوسرے متعلقہ فریقوں کی کیا توقعات ہیں؟ ذاتی اور سامنے آنے والے حالات کی حدود میں رہتے ہوئے وہ کون سے مثبت اور تعمیری اقدام ہیں جو اٹھائے جا سکتے ہیں؟ کیا ہم اعلیٰ تعلیم کے مثالی نمونے کا خواب دیکھیں اور اس کے لیے کام کریں یا ہم معاملات کو سابقہ طرز پر ہی چلانا چاہتے ہیں یا شاید ہماری یہ خواہش ہے کہ نصاب اور اس کے متن کو بدل کر اس کا ظاہری ڈھانچہ وہی رکھیں؟

'مابعد جدیدیت کے باوجود تعلیم' کے موضوع پر اپنی گفتگو میں زیگمنٹ بامان (Zygmunt Bauman, 2001) نے مشاہدہ پیش کیا کہ جدیدیت کی جانب بڑھتے ہوئے ممالک میں جامعات اب بھی اپنا وہ روایتی کردار ادا کر سکتی ہیں 'جہاں وہ ناپید ہو جانے والی تعلیم یافتہ اشرافیہ پیدا کرنے کی صنعت ہوا کرتی تھیں'۔ مغرب کی جامعات کو اس امر کی ضرورت ہے کہ 'وہ اپنے کردار پر نظر ثانی کریں کیونکہ دنیا کو اب ان کی روایتی خدمات کی مزید کوئی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں شان و شوکت کے اس کھیل کے نئے اصول و ضوابط طے کرنا ہوں گے اور ان اقدار کے متعلق بھی جن کے بارے میں شکوک و شبہات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے'۔ بامان نے مزید کہا کہ جامعات تیزی سے بدلتے ہوئے جدید عالمی سماجی اطوار اور غیر متوقع حالات کے ساتھ قدم بقدم نہیں چل پا رہی ہیں۔ مثال کے طور پر جب تک ایک طالب علم اپنی ڈگری حاصل کرنے کے قریب پہنچتا ہے تو جو علم اس نے اب تک حاصل کیا

ہے ممکن ہے کہ وہ اب متروک ہوگیا ہواور یہ امر مایوس کن ہے۔ بیسویں صدی میں ہمارے انسان دوست مغربی سائنسی نظریات مضحکہ خیز اور بعض مجرمانہ حد تک ناپختہ ہیں۔ جبکہ ۱۹ویں اور ۲۰ویں صدی کی بہت سی روایات جو جامعات کی جدید تحقیق میں مقصدیت پیدا کرنے کا مطلوب اثاثہ تھے، آج کی مسلسل تغیر پذیر دنیا میں ناخوشگوار بنتی جارہی ہیں۔ بامان کا کہنا ہے کہ جامعات بھی جدید دور کے تقاضوں پر پورا اتر سکتی ہیں بشرطیکہ وہ متنوع آراء، نصاب اور طریقہ کار متعارف کروائیں۔ اس صورت میں وہ اپنا مقصد پورا کرسکتی ہیں اور جدید دنیا کا ساتھ دے سکتی ہیں۔ تاہم اس نے اس بات کی جانب اشارہ نہیں کیا کہ یہ کس طریقہ کار کے تحت ممکن ہے۔

تدریسی ردعمل

اعلیٰ تعلیم میں حالیہ معاشی رجحان نے، جس کے تحت حکومتوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے فنڈز روک دیے ہیں یا ان میں کمی کردی ہے، ان اداروں کے لیے مسائل پیدا کردیے ہیں۔ خاص طور پر کاروباری جامعات میں جہاں مالی مسائل حل کرنے کے لیے طالب علموں کو ''گاہک'' سمجھا جاتا ہے وہاں جماعت کی تعداد اور استاد پر پڑھانے کا بوجھ بڑھتا جارہا ہے اس وجہ سے جامعات کے اساتذہ نے نصاب کو پڑھانے کے لیے بہت سے طریقہ کار اپنانے شروع کردیے ہیں۔ دو اساتذہ کی مثالوں کے ذریعے ہم اس طریقہ کار کو سمجھ سکتے ہیں:

ایک استاد طالب علموں کو خوفزدہ کرکے مصنوعی قلت پیدا کرتا ہے تاکہ وہ جماعت میں طالب علموں کی تعداد کم رکھ سکے اور پھر وہ بقایا نسبتاً کم تعداد اور بہترین طالب علموں کے گروہ کو عالمگیر شمال کے مختلف ڈگری پروگراموں میں داخلے کے لیے رہنمائی کرتا ہے اور اس بات سے لطف اندوز ہوتا ہے کہ اس کی رسائی میں ان اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جانے والے منتخب اور بہترین طالب علم ہیں جبکہ اس کے ساتھی اساتذہ اس سے زیادہ (طالب علموں کا) بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں۔ یہ استاد اپنی حکمت عملی کو معیاری دلیلوں سے درست ثابت کرتا ہے۔ اشرافیہ کی نمائندگی کرنے والے اپنے اس ساتھی کے برعکس ایک دوسرا استاد ہے جو کاروباری جامعہ کی ضرورت پوری کرنے کے لیے سیکڑوں طالب علموں کو

ایک ہی وقت میں پڑھانے کی ذمہ داری اٹھا لیتا ہے۔ وہ طالب علموں کو اوسط درجے کے ایسے امتحانات دیتا ہے جس میں نصابی متن سے صرف نظر کیا جاتا ہے اور ہر طالب علم بآسانی ان میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ وہ انہیں قبل از وقت سوالات بتاتا ہے۔ وہ سماجی ترقی کے اصول پر عمل پیرا ہے اور باہمی رضامندی سے ایک نئی طرح کا سماجی معاہدہ تخلیق کر رہا ہے جس میں کچھ زیادہ حاصل نہیں کیا جاتا۔

اگرچہ جامعہ کے استاد کا بنیادی مقصد تو درس وتدریس ہی ہے لیکن اوپر بیان کردہ صورتحال میں دونوں صورتیں کسی نہ کسی طور پڑھانے سے فرار فراہم کرتی ہیں۔ غالباً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مؤخر الذکر عوامی پہلو ہے اور اول الذکر اشرافیہ کا پہلو ہے۔ نتیجتاً دونوں ہی قسم کے اساتذہ کو تحقیقاتی مفاد اور سرکاری مالی امداد کی وصولی کے لیے زیادہ وقت مل جاتا ہے۔ اور اس میں بھی پیسے کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اگرچہ بسا اوقات یہ رقم ضائع ہی ہوتی ہے خاص طور پر اشرافیہ کی جامعات میں تو یہ ضیاع بہت زیادہ ہے۔

زیادہ اہم بات یہ ہے کہ دونوں صورتیں ہی اعلیٰ تعلیم میں ابھرتے ہوئے رجحان کی نشاندہی کرتی ہیں جو کہ تعلیمی اداروں میں ہمارے کردار کے متعلق سوچ بچار میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ پہلی قسم کا استاد طلبہ کے ''ادنیٰ تعلیمی معیار'' کا رونا روتا رہتا ہے اور نوآبادیاتی تعلیمی ادارے کی اشرافیہ کو قابو کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے لیکن یہ صورتحال اس امر کو نظر انداز کر دیتی ہے کہ بہت سی خواتین، رنگ ونسل اور مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے بہت سارے افراد، غریبوں اور نچلی سطح کے طبقات کے لوگوں کے لیے تاریخ میں پہلی مرتبہ تعلیمی اداروں کے دروازے اس طرح کھلے ہیں۔ اس بات کو نوآبادیاتی جامعہ کی اشرافیہ اور ان کے تخصص (Exclusivity) کے خلاف ایک فتح بھی سمجھا جاسکتا ہے الّا یہ کہ اوپر بیان کردہ نصابی مسائل سے مراد کسی ایک یا دوسرے قومی اصول کو مزید تقویت دینے کے مطالبے کے ذریعے اشرافیہ کی نبض کو قابو کرنا ہو۔

یقیناً اس مسئلے کے حل کے لیے ایک ممکنہ راستہ ہے جو ۵۰، ۶۰ یا ۷۰ فیصد جامعات کو بند کر دیتا

ہے تا کہ قلت اور اشرافیہ کے مسئلے پر قابو پایا جا سکے۔ لیکن اس طرح یہ دوبارہ پرانی نوآبادیات کی شکل اختیار کر لے گا۔ اس کے علاوہ، ہو سکتا ہے کہ بعض لوگ یہ تجویز دیں کہ اس قدر ادارے کھول دیے جائیں کہ ہر فرد کی ان تک بآسانی رسائی ہو سکے لیکن مقدار کا یہ مسئلہ حل ہونے سے معیار کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ یا اس تقسیم سے ہٹ کر، سول سوسائٹی، غیر سرکاری تنظیموں، خاندانوں یا مختلف اداروں اور جامعات کے مابین مذاکرات کی راہ اپنائی جا سکتی ہے، تا کہ جامعہ معاشرے کے اندر طبقات کے ساتھ زیادہ بہتر ہم آہنگی سے کام کر سکے۔

درحقیقت یہ وہ بات تھی جسے کلارک کیر (Clark Kerr, 2001) نے اپنی کثیر شعبہ جاتی جامعہ (Multiversity) کے تصور کے ذریعے متعارف کروایا تھا۔ یہ ایک ایسی تجویز ہے جسے یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے اہل علم حضرات سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جس پر ۴۰ سال بعد بھی شدید تنقید ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ آج بھی جامعات کی تعلیمی دنیا سے بہت سارے افراد اشرافیہ کے نمونے پر ہی عمل پیرا ہیں۔ لیکن کثیر شعبہ جاتی جامعہ کی کلارک کیر کی تجویز پر تنقید کی ایک معقول وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا حقیقی مقصد جامعات کو کاروباری ادارے بنانا تھا۔

لیکن اگر ہم اس نظریے کو وسیع کریں کہ جامعات محض پیسے کے پجاری کاروباری اداروں کو جوابدہ نہیں ہیں بلکہ یہ سول سوسائٹی، غیر سرکاری تنظیموں، رضا کاروں، عام ملازمین کے سامنے بھی جوابدہ ہیں تو شاید ہم کثیر شعبہ جاتی جامعہ یا Multiversity کے تصور پر عمل پیرا ہو سکیں جو یقیناً تعلیمی دنیا میں کمزوروں کی آواز کو سامنے لانے سے متعلق ہے۔ اس طرح ہم آج کی اعلیٰ تعلیم میں اداروں اور نصاب میں پیدا ہونے والے عدم توازن کو ختم کر سکتے ہیں۔

[یوسف جے پراگر جاپان میں ریتوسومیکان ایشیا پیسفک یونیورسٹی میں تقابلِ تہذیب و سماج (Comparative Cultures and Societies) کا مضمون پڑھاتے ہیں جہاں وہ کالج آف ایشیا پیسفک اسٹڈیز کے نائب سربراہ ہیں اور اس سے قبل انہوں نے میڈیا، کلچر اور سوسائٹی کے ایک پروگرام میں تعلیمی پروگرام کے

قائد کے طور پر بھی کام کیا۔]

(ترجمہ: زنیرہ اعظم رمنزہ صدیقی)

Source: Third World Resurgence No. 266/267, October/November 2012, pp 29-31.

.....حوالہ جات.....

- Aronowitz, S. *The Knowledge Factory: Dismantling the Corporate University and Creating True Higher Learning.* Beacon Press, 2001.
- Bauman, Z. *The Individualized Society.* Polity Press, 2001.
- Carnoy, M. *Education as Cultural Imperialism.* David McKay Company, 1974.
- Churchill, W. 'White Studies: The Intellectual Imperialism of Contemporary US Education', *Equity and Excellence in Education,* Vol. 19, Nos. 1 & 2, January 1981, pp. 51-57.
- Kerr, C. *The Uses of the University.* Harvard University Press, 2001.
- Miyoshi, M. 'Globalization, Culture and the University', in Jameson and Miyoshi(eds.) *The Cultures of Globalization.* Duke University Press, 1998.
- Readings, B. *The University in Ruins.* Harvard University Press, 1997.